جادو کی لکڑی

اشرف صبوحی

مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

جادو کی لکڑی

اور

جادو کا روپیا

اشرف صبوحی دہلوی

مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۲۵

© مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

تقسیم کار

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

Email:monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ 202002

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔ 400003

مئی 2012ء　　تعداد: 1000　　قیمت: -/10 روپے

کلاسک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

جادو کی لکڑی

بچو! اگلے وقتوں کا ذکر ہے...... تم یہی سمجھتے ہو گے میں کہوں گا ایک بادشاہ تھا، کیونکہ بادشاہوں کے قصّے سنتے سنتے تم تھک تو نہیں گئے؟ اگر تم نہیں تھکے تو سمجھ لو کہ میں تھک گیا اس لیے میں کہتا ہوں کہ کبھی کسی زمانے میں ایک لکڑی کا ٹکڑا تھا۔ کوئی قیمتی لکڑی تو نہیں۔ نہ صندل نہ آبنوس، بالکل معمولی جو چولھے میں جلائی جاتی ہے جس سے لوگ ایندھن کا کام لیتے ہیں۔

لکڑی کا یہ ٹکڑا جنگل کے کون سے درخت کا گدّا تھا۔ کس نے کاٹا، کون لایا، ہم نہیں کہہ سکتے۔ ہم نے تو اسے استاد

مولا خش (مولا بخش) قصبے کے بڑھئی کے گھر میں پڑا ہوا دیکھا۔ دیکھا کیا سُنا۔ اس کھوسٹ بڑھئی کو قصبے کے چھوٹے بڑے ''چونچ گلا'' کہا کرتے تھے، کیونکہ نجانے اس کی ناک پر زخم تھا یا نہیں مگر اس پر ہمیشہ لال مرہم سا لگا رہتا۔

ایک دن صبح ہی صبح ہاتھ منہ دھو کر چونچ گلے صاحب جب اپنے کام پر بیٹھنے لگے تو ان کی نظر اس لکڑی کے ٹکڑے پر پڑی۔ سوچا کہ بہت روز سے یہ یوں ہی پڑا ہے۔ آؤ، آج اسے کام میں لاؤ۔ دل میں کہنے لگا اور تو کسی کام کا نہیں، چارپائی کے پائے نکل آئیں گے۔ چودھری کی فرمائش بھی ہے، چیر ڈالو۔ اس کے تقاضے سے بھی نجات مل جائے گی۔

دل میں یہ خیال کر لکڑی کے ٹکڑے کو اٹھایا۔ موٹے موٹے چھال کے کھپرے اس پر چڑھے ہوئے تھے۔ چیرنے سے پہلے چاہا کہ اسے صاف کر لیں۔ ہاتھ اٹھایا ہی تھا جو ایک مہین سی آواز آئی: ''دیکھو! کیا کرتے ہو؟ اتنی بے رحمی؟ میں زخمی ہو جاؤں گا۔''

ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ آپ کے مکان میں جہاں نہ کوئی بچہ ہو نہ کوئی دوسرا بوڑھا، ایک اجنبی آواز سن کر بوڑھے چونچ گلے کو کتنی حیرت ہوئی ہوگی۔ غریب کا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا کہ آواز کِدھر سے آئی۔ میرے گھر میں کون آ گیا۔ اس نے مڑ کر چارپائی کے نیچے دیکھا، کوئی نہ تھا۔ کوٹھری میں منہ ڈال کر جھانکا، کچھ نظر نہ آیا۔ لکڑیوں کے ڈھیر کو اُلٹ پلٹ کر نظر ڈالی، کوئی نہیں۔ دالان سے نکلا صحن میں آیا۔ چڑیا کا بچہ بھی نہ پایا۔ دروازہ کھول کر باہر گلی میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں، گلی بھی سنسان تھی۔ مکان کی چھت پر چڑھا وہ بھی خالی تھی۔

"پھر کون تھا؟" اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنس کر کہنے لگا: "کچھ نہیں میرے کان بجے ہوں گے۔ کون ہو سکتا ہے؟ کیسی آواز؟ یوں ہی وہم کی باتیں ہیں۔ چلو اپنا کام کرو۔" اور بسولا اٹھا اس نے لکڑی پر دھر ہی دیا۔ بسولا پڑنا تھا کہ وہی ننھی سی آواز دردِ غم سے بھری ہوئی آئی: ہائے

ہائے! تم نے آخر مجھے زخمی کر ہی دیا۔"

اب تو چونچ گلے کے حواس جاتے رہے۔ آنکھیں خوف سے پتھرا گئیں۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور زبان باہر نکل پڑی۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ بڑی دیر کے بعد اس کے ہوش ٹھکانے آئے اور اس کی زبان کھلی تو دوڑتے ہوئے ہکلا ہکلا کر کپکپائی ہوئی آواز میں بولا: "اچھا تو مائی باپ تم کون ہو؟ مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ سامنے تو آؤ۔ تمھاری اس ننھی منّی دُکھ بھری داستان سے تو میرے دل میں درد ہونے لگا۔"

کوئی جیتا جاگتا ہوتا تو بولتا۔ لکڑیوں کے سوا وہاں کون تھا؟ لکڑیاں کبھی بولیں نہیں۔ ہاں اس خاص لکڑی میں جانداروں کا سا خاصہ ہو تو خدا جانے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ایک لکڑی کا ٹکڑا بچوں کی طرح چوٹ کھا کر بلبلا اٹھے اور روئے؟ میں تو یقین کر نہیں سکتا۔ یہ لکڑی کا ٹکڑا آخر لکڑی کا ٹکڑا ہی تو ہے دوسری لکڑیوں کی طرح۔ میرے یہاں نہ ہوتا تو کسی چولھے میں جلتا۔ اس سے ہنڈیا روٹی پکتی، پانی گرم ہوتا۔ میں

نے اس پر بسولا چلایا وہاں کلہاڑی بجتی۔ اچھا پھر؟ کیا اس کے اندر کوئی سمایا ہوا ہے؟ اگر اس کے اندر کوئی سمایا ہوا ہے تو میں بھی اس کے حق میں بھوت ہوں۔ جو بھی ہو مجھ سے بچ کر کہاں جائے گا؟ ٹھہر تو سہی۔ تو مجھے کیا ڈراتا ہے، میں تجھ سے ابھی سمجھ لیتا ہوں۔

یہ کہہ کر بڈھا بڑھئی جوانوں کی طرح تنا اور لکڑی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا زور زور سے پتھر پر مارنا شروع کر دیا۔ بڑی بے دردی کے ہاتھ مارتا اور ٹھہر جاتا۔

کان لگا کر سنتا کہ کوئی آواز تو نہیں آئی۔ پہلی دفعہ وہ دو منٹ تک ہاتھ روکے رہا۔ کچھ نہیں سنا۔ دوسری بار پانچ منٹ ٹھہرا رہا۔ کوئی آواز نہیں نکلی۔ تیسری مرتبہ دس منٹ انتظار میں رہا۔ پھر بھی نہ ہائے کی آواز سنائی دی نہ وائے کی۔

دل سے چونچ گلے کو ہنسی کیا آتی۔ ڈر اس کی چھاتی پر سوار تھا۔ مگر زبردستی وہ ہنسا۔ ہنسا بھی قہقہہ مار کر اور اپنی کھچڑی نما داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آپ ہی آپ بولا: ''بسولے کی

آواز میرے کانوں میں آہ آہ بن کر آتی تھی۔ اور کوئی ہوگا بھی تو میں نے بھگا دیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ شیطان نے کیا کام میں کھنڈت ڈالی ہے۔۔ چلو اپنے کام سے لگیں۔"

زبان سے تو وہ اپنی چھاتی مضبوط کرنے کے لیے سب کچھ کہہ رہا تھا لیکن دل کے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اوسان درست نہ تھے۔ خوف کو ٹالنے اور دھیان بدلنے کی غرض سے استاد مولا بخش نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک گیت نکالا اور بھینس کی طرح ڈکرانے لگا۔ گانے سے کسی قدر خیال بٹا تو بسولا آگے سے ہٹا کر رندا لیا اور ایک لکڑی پر چلانا شروع کیا۔ رندا دن پانچ دفعہ ہی چلا تھا کہ پھر وہی آواز آئی۔ اب کے اس آواز میں ہنسی تھی۔ جیسے کوئی کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولتا ہے:

"خوب خوب! تم تو گدگدیاں کرنے لگے۔ یہ اچھی بات نہیں۔"

آواز کا سننا تھا کہ بڑھئی پر بجلی سی گری۔ رندا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ غش کھا کر چت گر پڑا۔ آنکھیں بند

ہو گئیں، اور نہ جانے کتنی دیر بعد غریب کو ہوش آیا۔ آنکھ کھولی تو دیکھا زمین پر پڑا ہے۔ تہمد بھی کھل گیا ہے۔ تہمد باندھا، ناک پر جھلجھلاہٹ معلوم ہوئی۔ ہاتھ پھیرا تو مرہم چھٹ کر چھل گئی تھی۔

غریب کی چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ کالے کالے منہ پر لال لال ناک ایسی چمک رہی تھی جیسے توا ہنستا ہے۔ ہمت کر کے اٹھا اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اوزاروں کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے؟ اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

استاد مولا بخش میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر دیکھتا کون ہے کون نہیں؟ لیکن ہوا اس کے لیے غنیمت۔ کوئی سہی، بات چیت میں ذرا خیالات تو بٹیں گے۔ کواڑ صرف بند تھے۔ بیٹھے بیٹھے پکار کر کہا: "اندر آ جاؤ۔ دروازہ کھول لو۔ کنڈی نہیں لگی ہوئی۔"

چونچ گلے کی ہی عمروں کا ایک دبلا پتلا ٹھگنے قد کا گنوار

سا آدمی ہنستا ہوا اندر آیا۔ سر پر بڑے بڑے بال، توتے کی طرح لمبی مڑی ہوئی ناک، داڑھی ندارد، موچھیں کھڑ گنجی۔ یہ قوم کا ڈوم تھا۔ آواز خراب ہوگئی تھی اس لیے بستی کے لونڈے چڑانے کے لیے اسے پھٹا ڈھول کہا کرتے۔ لڑکے تو لڑکے، بڑے بھی جب اس کا تماشا دیکھنا چاہتے پھٹا ڈھول کہہ کر چھیڑ دیتے۔ پھر یہ آئے تو جائے کہاں؟ وہ تھرکتا وہ مٹکتا ایسی گالیاں بکتا کہ ثقہ سے ثقہ آدمی بھی ہنسے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خاصی تھوڑی دیر کے واسطے دل لگی ہو جاتی۔

نام تو اس کا یاد نہیں۔ اس کی روح خوش ہو یا ناراض، پھٹا ڈھول تھا بڑا چیخنے والا۔ غصہ ہر وقت ناک پر دھرا رہتا۔ بڑا چھوٹا، امیر غریب، عورت مرد کوئی پھٹا ڈھول کہہ تو دے۔ کمبختی آ جاتی۔ کسی کا لحاظ نہ کرتا۔ بکواس جو شروع ہوتی تو خدا ہی روکتا تو رکتی اور تو کچھ بس چلتا نہیں تھا اپنے آپ کو پیٹ پیٹ ڈالتا۔

یہ وہی حضرت تھے جن کا نام بھی یاد آ گیا۔ چندا نام تھا۔

خیر چندا چندو یا پھٹا ڈھول ہمارے واسطے ایک ہی بات ہے۔ ہم کوئی اسے پڑا تھوڑی رہے ہیں۔ بہرحال اپنے پرانے یار بڑھئی کے گھر تشریف لائے۔

ڈوم: استاد مولا بخش! اپنے ٹھیے پر کیوں نہیں بیٹھتے؟

بڑھئی: خالی تو نہیں، چیونٹیوں کو کام سکھا رہا ہوں۔

ڈوم: اچھے رہو گے۔ مگر دیمک کو سکھاتے تو زیادہ اچھا تھا۔

بڑھئی: آج تم اِدھر کیسے نکل آئے؟ کس طرح آنا ہوا؟

ڈوم: اپنی ٹانگوں سے۔

بڑھئی: میں سمجھا تھا ہاتھوں کے بل آئے ہو۔

ڈوم: استاد! میں تمھارے پاس ایک مطلب سے آیا ہوں۔

بڑھئی: کہو۔

ڈوم: میرا ایک کام ہے، کر دو گے؟

بڑھئی: سر آنکھوں سے۔

ڈوم: ہاتھوں سے نہیں۔

بڑھئی: ہاتھوں سے کرنے کا ہوگا تو ہاتھوں سے۔ پاؤں سے

کرنے کا ہوگا تو پاؤں سے۔ کہو تو۔ آؤ بیٹھو۔ کھڑے کب تک رہوگے۔

ڈوم: (بیٹھ کر) آج صبح ہی صبح بیٹھے بیٹھے ایک بات میرے دماغ میں آئی۔

بڑھئی: وہ کیا؟

ڈوم: گانے میں تو اب کچھ مزا نہیں رہا۔

بڑھئی: اور تمھارے گانے میں مزا تھا کب؟

ڈوم: آگے کچھ کہا تو اچھا نہیں ہوگا۔

بڑھئی: کہوں گا کیا؟ سب جانتے ہیں کہ تم.....

ڈوم: (تیز ہو کر) داڑھی کی بھی خیر نہیں۔

بڑھئی: مرد آدمی دھوتی سے کیوں نکلے پڑتے ہو۔ کون نہیں جانتا کہ تم.....

ڈوم: کہ تم کیا؟

بڑھئی: یہی کہ تم پیشے سے اکتا گئے ہو اور اکتانے کی بات یہی ہے کہ کوئی قدردان نہیں رہا۔

ڈوم: ہاں یہ کہو۔ تو اب روٹی کا کوئی اور حیلہ کرنا چاہیے۔

بڑھئی: ضرور۔ آدمی جب تک جیتا ہے، کھائے بغیر گزارا نہیں۔

ڈوم: پھر میرے ساتھ تو کئی کھانے والے ہیں اور آمدنی کچھ رہی نہیں۔ اچھا تو مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے۔

بڑھئی: کیا ترکیب سوجھی ہے سناؤ۔

ڈوم: پتلیوں کا تماشا کرنے والا اس زمانے میں کوئی نہیں رہا۔ میرے خیال میں ایا ہے کہ اگر جیسی میں چاہتا ہوں دو پتلیاں بن جائیں تو پھر آمدنی ہی آمدنی ہے۔ پوچھو کیسی؟ ایسی جو ناچیں بھی، لڑیں بھی، آنکھیں بھی چلائیں، بھوئیں بھی مٹکائیں اور نٹوں نٹنیوں کی طرح اچھلیں کودیں، قلابازیاں بھی کھائیں۔ پھر میں پتلیوں والا بن جاؤں گا اور شہر شہر پھر کر خوب کماؤں گا۔ کیوں، تمھاری کیا صلاح ہے؟

ڈوم کے بات ختم کرتے ہی وہی مہین سی آواز آئی:

"واہ رے پھٹے ڈھول کیا کہنا ہے۔"

ڈوم کو شیطان نے انگلی دکھائی۔ وہ پھٹا ڈھول اپنا نام سن کر آپے میں رہتا۔ لڑائی کا مرغا بن کر بیٹھے سے کھڑا ہو گیا اور آنکھیں نکال بڑھئی سے کہنے لگا:

ڈوم: یہ تو نے کیا کہا؟

بڑھئی: کیا کہا؟

ڈوم: ابھی کچھ کہا ہے نا؟

بڑھئی: کیا؟

ڈوم: وہی بُرا نام۔

بڑھئی: کون سا بُرا نام؟

ڈوم: پھٹا ڈھول، پھٹا ڈھول۔

بڑھئی: میں نے تمھارا یہ نام نہیں لیا۔

ڈوم: تو نے نہیں کہا تو کیا میں نے کہا۔ میں اپنا ایسا بُرا نام لوں گا؟

بڑھئی: مگر میں نے نہیں کہا۔

ڈوم: تُو نے ہی کہا، تُو نے کہا۔

بڑھئی: نہیں۔

ڈوم: ہاں۔

بڑھئی: نہیں نہیں۔

ڈوم: ہاں ہاں ہاں۔

ڈوم تو آتش بازی کی چھچھوندر تھا ہی، بڑھئی بھی پٹاخہ بن گیا۔ دونوں طرف بڑھتے بڑھتے ایسی گرمی بڑھی کہ تو تکار سے گالی گلوچ پر اتر آئے۔ زبان چلتے چلتے ہاتھ چلنے لگے۔ گھونسے، مکّے، لاتیں چلاتے چلاتے وہ دونوں بڈھے ایک دوسرے پر پل پڑے۔ اس نے اُس کو کاٹا۔ اِس نے اُس کی ناک پر ناخن مارے۔ غرضیکہ خوب گتھم گتھا ہوئی۔ جب ہانپ گئے تو بڑی مشکل سے الگ ہوئے۔

بڑھئی کی داڑھی اور ڈوم کے سر کے بال چھوٹے تھے۔ ڈوم گنجا تھا اور بڑھئی خوجہ۔ دونوں نے مصنوعی بال اور دکھاوے کی داڑھی لگا رکھی تھی۔ لڑنے میں ڈوم نے بڑھئی کی

داڑھی نوچ لی تو بڑھئی نے ڈوم کے بال کھسوٹ لیے۔ کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں تو بڑھئی کی داڑھی ڈوم کے منہ میں ہے اور ڈوم کے بال بڑھئی کے ہاتھ میں۔

بڑھئی: کمبخت! تو نے میری داڑھی اکھاڑ لی۔

ڈوم: کمبخت تو، تیرا باپ۔ تو نے میرے بال کیوں اتارے؟

بڑھئی: میں نے جان کر اتارے ہیں کیا؟

ڈوم: اور کیا میں نے تیری داڑھی جان کر اتاری ہے؟

بڑھئی: (چیخ کر) سیدھے ہاتھ سے میری داڑھی مجھے دے دے۔

ڈوم: اور تو میرے بال حوالے کر۔

بڑھئی: لے۔

ڈوم: لے۔

بڑھئی: آؤ ملاپ کریں۔

ڈوم: وہ نام تو پھر نہیں لوگے؟

بڑھئی: میں نے تو پہلے بھی نہیں لیا تھا۔

ڈوم: خیر جانے دو۔

دونوں دوستوں نے ہانپتے ہوئے ہاتھ ملائے اور قسم کھائی کہ جب تک جیتے ہیں اسی طرح دوست رہیں گے۔ کچھ بھی ہو، کبھی نہیں لڑیں گے۔ بڑھئی نے ڈوم کے بال اور ڈوم نے بڑھئی کی داڑھی اپنے ہاتھ سے لگا دی۔

تھوڑی دیر میں سانس درست ہو گئے تو بڑھئی یہ ظاہر کرنے لگا کہ میرے دل میں کوئی ملال نہیں۔ پہلے ہی جیسا دوست ہوں۔ ڈوم سے کہنے لگا "ہاں بھئی تو تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمھیں ایسی پتیاں بنا دوں۔"

ڈوم: بنوانے کو تو میں نے ایک اور کاریگر تاک رکھا ہے۔ تمھیں تکلیف نہیں دوں گا۔ لکڑی چاہتا ہوں کوئی ایسی، جس سے ویسی ہی پتیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔

بڑھئی: لکڑی بھی ایسی دوں گا۔ یاد رکھو۔ تم پچھتاتے ہو گے بعد میں کہتے ہو کوئی چال تھی ہو۔

یہ کہتے ہوئے بوڑھے چونچ گلے بڑھئی نے خوشی خوشی ہاتھ بڑھا، وہی لکڑی کا ٹکڑا جس کی بدولت دوست سے ہاتھا پائی تک ہوگئی تھی، جس نے صبح سے پریشان کر رکھا تھا، اٹھایا اور اپنے دوست ڈوم کو دینے کے لیے زمین سے کوئی بالشت بھر اونچا کیا ہوگا کہ اس نے بڑھئی کو ایک دھکا سا دیا اور بل کھاتے ہوئے ہاتھ سے نکل کر ڈوم کی سوکھی ننگی پنڈلی پر ایسا پڑا کہ رہے نام سائیں کا۔ غریب تڑپ اٹھا۔

ڈوم: ہائے ہائے مار ڈالا۔ استاد مولا بخش! میں پوچھتا ہوں تم نے میرے ساتھ یہ کب کا بیر نکالا ہے؟ ایک پرانے دوست کی خاطر کرنے سے تو رہے تم نے تو میری ٹانگ توڑ دی۔ لنگڑا کر دیا۔

بڑھئی: میں قسم کھاتا ہوں میں نے تمھارے چوٹ نہیں لگائی۔

ڈوم: تو تمھارا یہ مطلب ہے کہ میں نے اپنے پاؤں میں آپ لکڑی ماری ہے۔

بڑھئی: نہ تم نے اپنے آپ ماری۔

ڈوم: تم نہیں میں نہیں، پھر؟

بڑھئی: سارا قصور لکڑی کا ہے۔ اسے الزام دو۔

ڈوم: میاں تم کچھ بھنگ پی کر تو نہیں بیٹھے ہو۔ ہوش کی باتیں کرو ہوش کی۔

بڑھئی: میں کوئی نشے باز ہوں؟ تم نے اتنی عمر میں مجھے کبھی کوئی نشہ کرتے دیکھا ہے۔ میں تو جانوں آج سویرے سویرے کہیں سے بھنگ پی آئے ہو۔

ڈوم: میں بھنگ پی آیا ہوں؟ نشے بازوں کی سی باتیں تم کرو اور بھنگ میں نے پی لی ہے۔ یہ لکڑی کس نے ماری؟

بڑھئی: کہہ رہا ہوں کہ اس میں میری خطا نہیں۔ لکڑی کی خطا ہے۔

ڈوم: مانتا ہوں کہ چوٹ لکڑی سے لگی ہے لیکن مارنے والے تو تم تھے۔ مجھے الزام نہ دیں۔

بڑھئی: میں نے تمھارے چوٹ نہیں لگائی۔

ڈوم: اور کس نے لگائی؟

بڑھئی: لکڑی نے۔

ڈوم: بدمعاش، دغاباز، جھوٹا۔

اب ڈوم کا پارہ چڑھتا جاتا ہے۔

بڑھئی: چندا دیتیو، زبان کو لگام دو، ورنہ میں بھی کچھ کہہ بیٹھوں گا۔

ڈوم: کیا کہو گے تم؟

بڑھئی: پھٹا ڈھول۔

ڈوم: گدھا۔

بڑھئی: پھٹا ڈھول۔

ڈوم: الو

بڑھئی: پھٹا ڈھول۔

بس اب کیا تھا دونوں پھر گتھم گتھا ہو گئے اور لگے گھوسم گھاسا ہونے۔ ایک کی دھوتی ڈھیلی ہو گئی تو دوسرے کا تہبند کھل گیا۔ لیکن دونوں کے ہاتھ اور پاؤں برابر چلتے رہے۔

ڈوم نے ایسا گھونسا مارا کہ بڑھئی کی نکسیر پھوٹ گئی۔ بڑھئی نے ڈوم کی انگلی چبا ڈالی۔

ڈوم: اب تو پھر کبھی مجھے پھٹا ڈھول نہیں کہو گے۔

بڑھئی: پھٹے ڈھول کو پھٹا ڈھول نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟

ڈوم: لو یہ تو پھر تم نے لڑائی کی بات کی۔

بڑھئی: میں تو کسی سے لڑنا نہیں چاہتا۔

ڈوم: میرا بھی سر نہیں پھرا کہ تم سے لڑوں۔

بڑھئی: سچ کہتے ہو؟

ڈوم: بالکل سچ۔ میں اگر آج کے بعد تم سے لڑوں تو دوزخ میں جلوں۔

بڑھئی: اور میں تم سے لڑوں تو مجھ میں کیڑے پڑیں۔

ڈوم: تو ہاتھ ملاؤ۔

بڑھئی: یوں نہیں گلے ملو۔

جب دونوں گلے ملے تو تڑاق سے ڈوم کی چیخ نکل پڑی۔

ڈوم: ارے ظالم، دغاباز۔ پھر لکڑی ماردی تم نے؟

بڑھئی: پاگل ہوئے ہو کیا؟ میں نے کب لکڑی ماری؟ لکڑی تو رکھی ہے۔

بڑھئی نے جو مڑ کر دیکھا تو تڑاق سے لکڑی اس کی کمر پر بھی پڑی۔ دونوں پھر ایک دوسرے پر پل پڑے لیکن ساتھ ہی لکڑی بھی برسنے لگی۔ کبھی بڑھئی کی پیٹھ پر، کبھی ڈوم کی ٹانگوں پر۔ تابڑ توڑ جو دونوں کو پانچ سات لکڑیاں پڑیں تو دونوں ایک دوسرے سے علاحدہ ہو گئے اور خوف کے ساتھ اس لکڑی کی طرف دیکھنے لگے جو زمین پر پڑی ہوئی تھی۔

ڈوم: دوست تم یہ لکڑی کہاں سے لائے تھے؟ میرا خیال ہے اس لکڑی میں ضرور کسی جن کا اثر ہے۔

بڑھئی: تم سچ کہتے ہو۔ یہ شک تو مجھے پہلے ہی ہوا تھا۔

ساتھ ہی ساتھ اس نے لکڑی میں سے آواز آنے کا واقعہ سنا دیا۔

ڈوم: میری بات سنو۔ اسے جہاں سے لائے تھے وہیں

چھوڑ آؤ، ورنہ یہ اور بھی خرابی لائے گی۔

بڑھئی: میں اکیلا تو ہرگز نہیں جاؤں گا۔ تم بھی ساتھ چلو۔

ڈوم: ہاں چلو۔

بڑھئی: تو اٹھاؤ پھر۔

ڈوم: میں اٹھاؤں؟ توبہ کرو۔ تم اٹھاؤ تمھاری لکڑی ہے۔

بڑھئی: میری شامت آئی ہے جو میں اٹھاؤں۔

ڈوم: یوں کرو اس پر رضائی ڈال دو اور رضائی میں لپیٹ دو۔ پھر دونوں اٹھا کر لے چلیں گے۔

بڑھئی کو یہ تجویز پسند آئی۔ وہ اندر سے رضائی اٹھا لایا اور لکڑی پر ڈال کر اسے لپیٹ لیا۔ پھر دونوں اٹھا کر جنگل کو ہو لیے۔ جنگل میں پہنچ کر انھوں نے لکڑی رضائی سمیت وہیں ڈال دی اور بے تحاشا گھر کو ایسے بھاگے کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

☆☆☆

جادو کا روپیا

بوڑھا یوسف ایک پرانا کسیرا تھا۔ وہ گاؤں گاؤں جاتا اور کیتلیاں اور کڑھائیاں وغیرہ بنا بنا کر بیچا کرتا۔ یہی اس کے ہاتھ کی کاری گری اور یہی اس کی تجارت تھی۔

ایک روز وہ اپنا چھوٹا سا تھیلا لیے جس میں ایک تنو جتا ہوا اور بکری کی چیزیں بجی ہوئی تھیں ایسے راستے سے گزرا جس میں لوگ آباد نہیں تھے۔ وہاں اس نے دیکھا کہ ایک بڑھیا آگ سلگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بڑھیا سبز رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھی اور لال چادر اس کے کندھوں پر تھی۔ بوڑھا یوسف ہنستا اور دیکھتا، دیکھتا بڑھیا کے پاس پہنچ گیا۔

جوں ہی بوڑھا اس کے برابر پہنچا، چولھے میں آگ بھڑک اٹھی اور لکڑیاں چٹخنے لگیں۔ جب آگ جل اٹھی تو بڑھیا نے ایک ٹوکری میں سے تین بھورے رنگ کے خوبصورت انڈے نکالے۔ انڈے ہاتھ میں لیے لیے اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ایک دفعہ نہیں بلکہ دو تین بار۔ اس کے بعد نظر اوپر اٹھائی۔ سامنے بوڑھے کو ٹھیلا لیے کھڑے پایا۔ پھر اسے آواز دے کر کہا:

بڑھیا: بڑے میاں! ذرا ایک منٹ ٹھہرنا۔

بوڑھا: (ٹھہر کر) کیا بات ہے؟

بڑھیا: اے ہے، کیا کہوں۔ بڑی مصیبت کا سامنا ہے۔ جس پتیلی میں انڈے ابالا کرتی تھی وہ نہ جانے کہاں جاتی رہی۔ خدا معلوم میں نے کہاں رکھ دی۔ ذرا تم آکر دیکھنا۔

بوڑھے نے ادھر اُدھر دیکھا مگر اسے کوئی پتیلی نہ دکھائی دی۔

بوڑھا: مائی جانے والی چیز کا اب کیا غم اور لے لو۔ میرے پاس کئی طرح کی چھوٹی بڑی پتیلیاں ہیں۔

بڑھیا: اچھا دکھاؤ۔

بوڑھے نے اپنے تھیلے میں ڈھونڈ کر ایک چھوٹی سی پتیلی نکالی۔

بوڑھا: اور ہے بھی سستی۔ میں تم سے مزدوری نہیں لوں گا۔ لاگت کی لاگت ایک روپے میں دے دوں گا۔

بوڑھے یوسف نے واقعی بڑھیا کے ساتھ بڑی رعایت کی تھی۔ کسی دوسرے کے ہاتھ بیچتا تو بہت زیادہ دام لیتا۔

بڑھیا نے بڑے میاں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پتیلی لے لی اور اس میں تینوں انڈے رکھ دیے۔ اس کے بعد بڑھیا نے اپنا بٹوا نکالا اور اسے ٹٹول دیکھا۔ پھر اپنی گہری جیب کو ہاتھ ڈال کر ٹٹولا۔ پھر اپنی جوتی کی ایڑی میں انگلی ڈالی۔

جب یہ سب ٹٹول چکی تو ہڑبڑا کر کہنے لگی: "افسوس

بڑے میاں! میرے پاس اس وقت روپیا نہیں ہے۔ اب کے جو تم ادھر آؤ گے تو میں تمھارا روپیہ دے دوں گی۔''

اس کے بعد بڑھیا نے دوبارہ بوڑھے کسیرے کا شکریہ ادا کیا اور اپنے انڈوں کی دیکھ بھال میں لگ گئی اور بوڑھا اپنا ٹٹو ہانک کر آگے روانہ ہو گیا۔

دوسری مرتبہ بوڑھا جب ویرانے کی طرف سے گزرا تو اس نے بڑھیا کا خیال کر کے آواز لگانی شروع کی۔ وہ سمجھتا تھا کہ جس طرح بعض لوگ ایسی جگہ اپنی جھونپڑیاں بنا لیتے ہیں، بڑھیا بھی رہتی ہو گی۔ دس دس بیس بیس گز کے فاصلے پر وہاں جھونپڑیاں تو تھیں اور ان میں آدمی بیٹھے اٹھتے نظر آئے لیکن وہ بڑھیا کہیں دکھائی نہیں دی۔ اس نے کئی دفعہ آواز لگائی کہ شاید آواز سن کر وہ کسی جھونپڑی سے نکل کر آئے مگر وہ ہوتی تو نکلتی۔

بوڑھے کی آواز بڑی تیز اور سریلی تھی اور وہ یہ کہہ کر اپنی چیزیں بیچتا تھا۔

ہنڈیاں تسلے توے پرات
لے لو لے لو ہاتھوں ہاتھ
لٹا دیا ہے سستا مال
آؤ دیکھو میرے لال

کئی عورتیں بوڑھی، جوان اس کے ٹھیلے کے پاس آئیں۔ نہیں آئی تو وہی سبز کپڑوں اور لال چادر والی بڑھیا جس سے اسے روپیا لینا تھا۔

اسی طرح جب اسے آتے جاتے بہت دن ہو گئے اور بڑھیا نظر نہ آئی تو بوڑھا یہ سمجھا کہ وہ قرضہ ادا کرنا نہیں چاہتی۔ اس عرصے میں بوڑھا بہت کمزور ہو گیا تھا اور بیمار بھی رہنے لگا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے کبھی روپے بارہ آنے کا مال بیچ لیا تو کئی دن اسی آمدنی پر بسر کرتا۔

ایک روز صبح صبح نکل کر آہستہ آہستہ بستی کی طرف چلا۔ سورج نکلا ہوا تھا۔ بوڑھے نے سوچا کہ ذرا سا چکر تو پڑے گا بڑھیا والے ویرانے میں سے ہو کر نکلو، شاید وہ نظر آجائے۔

ویرانے میں کوئی آدھا راستہ طے کیا ہوگا کہ اس کے کانوں میں آواز آئی: ''بڑے میاں بڑے میاں! ذرا ٹھہرنا۔''

بوڑھے کو یہ آواز کچھ جانی پہچانی سی معلوم ہوئی۔ مڑ کر دیکھا تو آواز دینے والی وہی بڑھیا تھی جس نے اس سے پتیلی خریدی تھی۔ تعجب پر تعجب تھا کہ بڑھیا نے آتے ہی بوڑھے سے اس طرح باتیں کرنی شروع کیں جیسے کل ہی اس نے پتیلی خریدی ہو۔ حالانکہ پتیلی خریدے کئی برس ہو چکے تھے اور بڑے میاں کے ہاتھ پر روپیا رکھ کر ایسی گئی کہ پھر نظر نہ آئی۔

بڑھیا کے جانے کے بعد بڑے میاں نے جو روپے کو دیکھا تو وہ بہت چمکدار تھا اور اس میں ایک چھید بھی تھا۔ بڑے میاں نے اپنی ساری عمر میں چمکیلا روپیا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے وہ چاہتا تو یہ تھا کہ اسے خرچ کرنے کے بجائے اپنے پاس رکھے مگر کھانے پینے کا سامان خریدنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے نانبائی کو روپیا دے کر روٹی لی اور اس میں سے جو پیسے بچے ان کی دوسری چیزیں خریدیں اور واپس گھر لوٹا۔

گھر آ کر پہلے تو بوڑھے نے اپنے ٹٹو کے آگے گھاس ڈالی پھر چولھا سلگا کر اپنے لیے تھوڑا سا دلیا پکایا۔

اب وہ کھانے کو بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر کسی کے آنے کی آہٹ سی ہوئی۔ باہر جا کر دیکھا کہ نانبائی کی بیوی کھڑی ہے۔ عورت نے بڑے میاں کو روپیا دیتے ہوئے کہا: "بابا! یہ تمھارا روپیہ ہے؟ اسے دیکھ کر مجھے اپنے بچپن کا قصہ یاد آ گیا اور اس قصے کی قیمت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ میں اس کو تمھیں واپس کر دوں۔ اس لیے اپنا روپیا اپنے پاس رکھو کیونکہ وہ قصہ اس سے بہت زیادہ قیمتی ہے۔"

اتنا کہہ کر عورت نے روپیا بڑے میاں کو پکڑایا اور چل دی۔ بڑے میاں نے روپے کو نہایت غور سے دیکھا۔ یہ وہی بڑھیا والا روپیا تھا جو بہت چمکیلا تھا اور اس میں چھید تھا۔

بڑے میاں نے گھر آ کر روپیا طاق پر رکھ دیا اور دل میں کہا کہ آیندہ اسے کبھی اپنے سے الگ نہیں کروں گا۔ اتفاق کی بات کوئی ایک ہفتہ ہی گزرا ہوگا کہ بڑے میاں کو کمزوری

نے اتنا ستایا کہ گوشت کا شوربا پینے کی ضرورت ہوئی۔ اس روپے کے سوا اس کے پاس ایک پیسا نہ تھا۔ مجبوراً وہی روپیا لے کر قسائی کی دکان پر گیا۔ قسائی سخت بدمزاج اور بڑا آدمی تھا۔ جس سے بات کرتا لڑا کر۔ اس نے بڑے میاں کو آٹھ آنے میں گوشت کا ایک چھوٹا سا پارچہ دیا تھا اور باقی آٹھ آنے واپس کر دیے۔

بڑے میاں کو گوشت کی کمی کا اتنا رنج نہیں ہوا جتنا اس روپے کے خرچ کرنے کا۔ اسے یقین تھا کہ اب یہ روپیا اس کے پاس نہیں آئے گا۔ گھر پہنچا تو بہت اُداس اور غمگین۔ اس لیے کہ کھانے پینے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ روپیا بھی قسائی کے غلّے میں چلا گیا تھا۔ شوربا پکا کر اس نے پیا تو مگر جیسے خون کے گھونٹ۔

ابھی وہ آگ کے پاس ہی بیٹھا تھا کہ دروازے پر دھم دھم کرتا ہوا کوئی آیا۔ یہ دھما دھم کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ اس کا کمزور دل دھڑکنے لگا۔ جلدی سے دروازے پر

گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ قسائی غصے میں بھرا کھڑا ہے۔ بڑے میاں کے سامنے آتے ہی اس نے غرا کر کہا:

"بڑے میاں! یہ رہا تمھارا روپیا۔ اس نے تو مجھے پریشان کر ڈالا۔ خدا کے لیے اس کے ساتھ مجھ سے چار اشرفیاں بھی لے لو۔ کہیں میرا پیچھا تو چھوٹے۔ میرے ساتھ ایسے واقعات تو ساری عمر میں کبھی پیش نہیں آئے۔"

یہ کہہ کر قسائی نے وہی روپیا اور چار اشرفیاں بوڑھے کو دے دیں اور چلتا بنا۔ اس طرح جادو کے روپے سے سودا خریدنے اور برابر اس کے واپس آ جانے سے بوڑھا خاصا امیر ہو گیا۔ روپیا کیوں کر واپس آ جاتا تھا اس کا بھید نہ کسی دوسرے پر کھلا نہ بوڑھے یوسف پر۔

☆☆☆

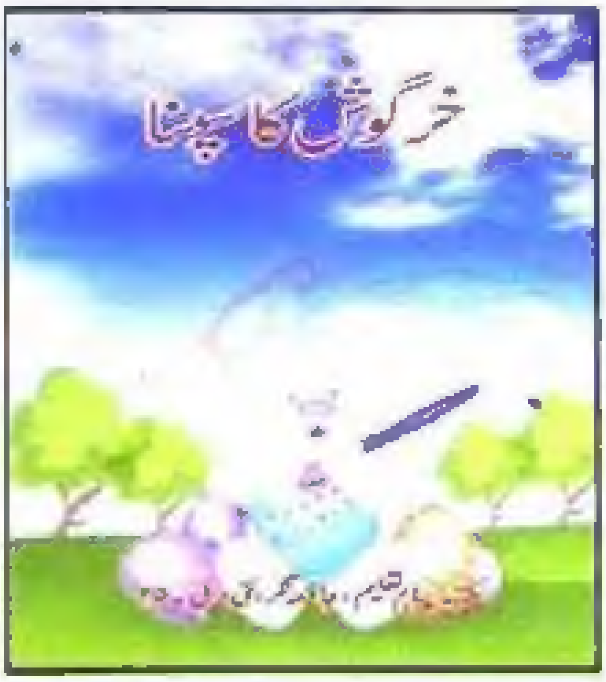
خرگوش کا سپنا
مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
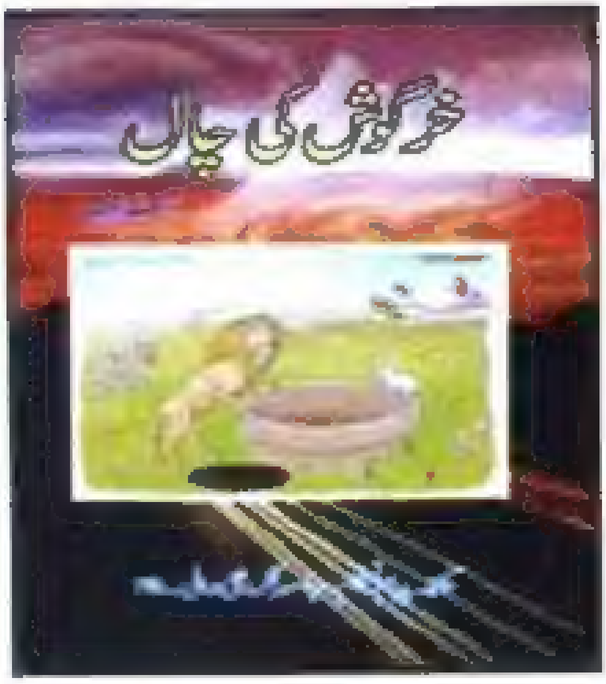
خرگوش کی چال
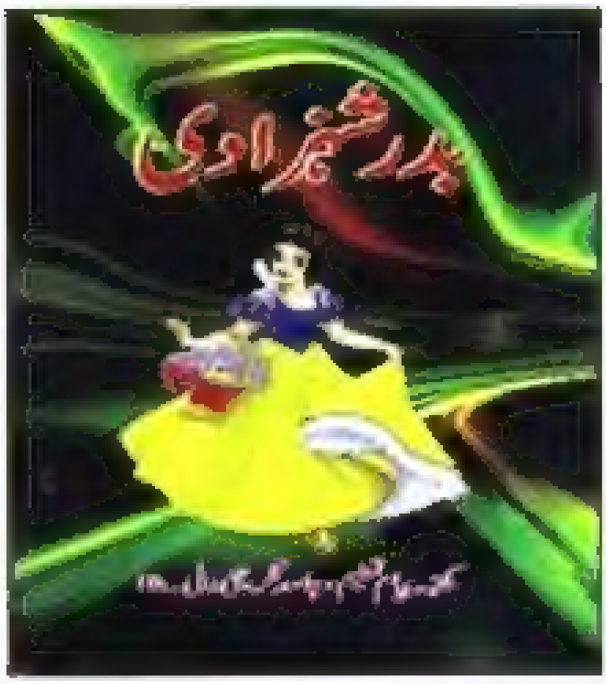
بدر شہزادی
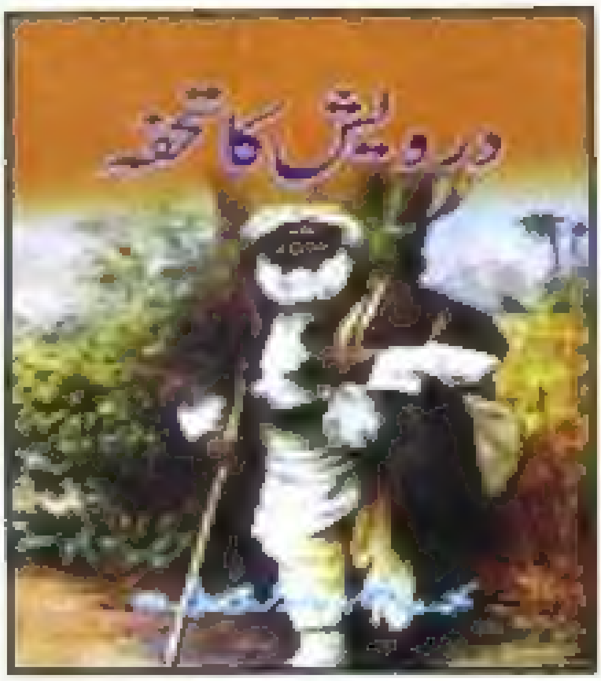
درویش کا تحفہ
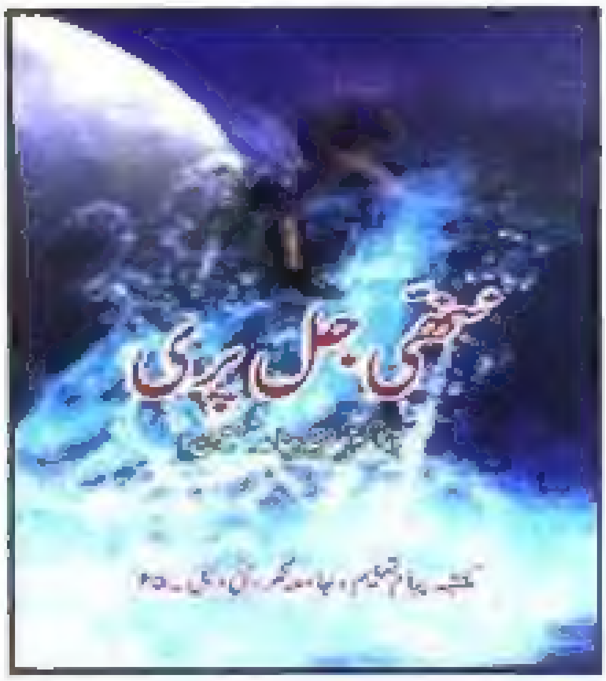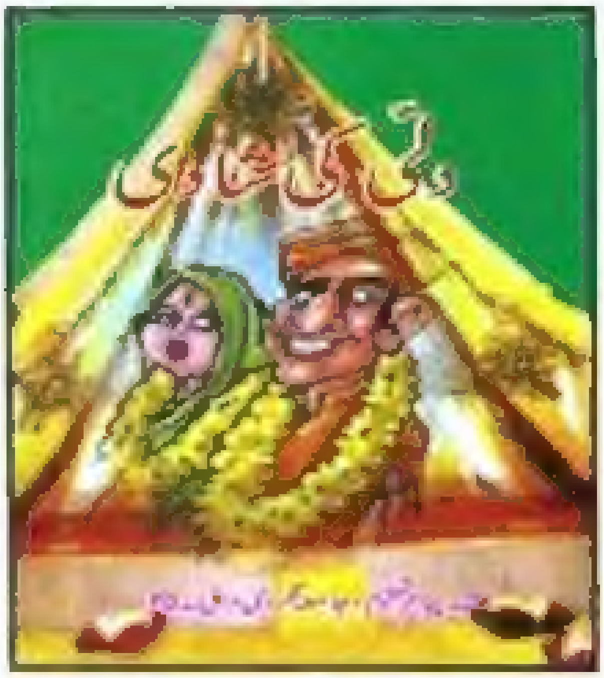
جل پری
مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵